مقالات

کتب سماوی پر ایک نظر

کتب ہنود

۱۶

از جناب فوقی شاہ صاحب

تاریخ ہنود (بقیہ) ہندو قوم یا ہندو اقوام کے ہند میں داخل ہونے کے متعلق جتنے نظریے مضمون ماقبل میں پیش کیے گئے ہیں ان میں سے ظاہر ہے کہ کوئی ایک ہی نظریہ درست ہو سکتا ہے یا ممکن ہے کہ ایک بھی درست نہ ہو، اور آیندہ کسی مزید علم کی بنا پر کوئی اور نظریہ قائم کیا جا سکے جو بادی النظر میں زیادہ صحیح معلوم ہو۔ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ یہ سب ظنیات ہیں اور انکا ہمیشہ اور ہر موقع پر صحیح ہونا لازمی نہیں۔ یہ دور ماقبل تاریخ نکتوبی کی باتیں ہیں جن کی بابت کچھ کہنا گویا تاریکی میں تیر چلانا ہے۔ مذہبی گروہ کے لیے بس ایک امر یقینی ہے کہ یہ سب لوگ انسان ہیں اور ہم اور وہ ایک ہی دادا کی اولاد ہیں۔ زمانہ حال کے بعض محققین کو بھی مذہبی گروہ سے اس معاملہ میں اتفاق ہے۔

الفریڈ رسل والس (۱۸۲۳ - ۱۹۱۳) Alfred Russel Wallace جملہ بنی نوع انسان کو ایک ہی نسل سے قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فطری قوانین کے ماورا ایک بالاتر قانون بھی ہے جس کے تحت میں انسان کی دماغی اخلاقی اور روحانی پرورش

وتربیت ہوتی ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جس طرح انسان حیوانات و نباتات پر تصرف کرتا ہے اور انہیں ادنی سے اعلیٰ حالت پر لے جاتا ہے، اسی طرح ایک برتر ہستی کسی مقصد خاص کو پیش نظر رکھ کر انسان کی رہنمائی کرتی ہے، اور انسان کو ایک سمت خاص میں ادنی سے اعلیٰ حالت کی جانب لے جاتی ہے یہ وہی والس ہیں جن کی علمی تحقیقات سے ڈارون نے بہت مدد لی ہے اور جن کی غیر معمولی علمی و محققانہ قابلیت کا اس نے اعتراف کیا ہے مگر اس معاملہ میں ان کی بلندی تک وہ خود نہ پہنچ سکا۔

ڈارون بھی باوجود اپنے نظریہ لنگوریت کے یہ اعتراف کرنے پر مجبور رہا ہے کہ انسان باوجود اختلافات باہمی کے اپنی ساخت اور ذہنی و طبّی خصوصیات میں اس درجہ متحد و مماثل پائے جاتے ہیں کہ وہ سب ایک ہی جد اعلیٰ کی اولاد معلوم ہوتے ہیں۔

سینٹ جارج میوٹ (۱۸۲۷ء - ۱۹۰۰ء) St. George Mivart) اسی زمانہ کا ایک مشہور سائنس دان اور ماہر علوم حیوانات گذرا ہے۔ اُس کا نظریہ یہ ہے کہ جسمانی اعتبار سے انسان فطری ارتقار اور روحانی اعتبار سے فوق البشری قدرت سے پرورش پاتا ہے۔

چنانچہ مذہبی گروہ کے صحیح عقیدہ کی رو سے جمیع نوع بشر ایک ہی دادا کی اولاد ہیں اور ہندوستان اس دنیا میں بنی نوع انسان کا سب سے پہلا وطن ہے۔ کیونکہ حسب روایت مشہور ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کا دنیا پر نزول سیلون (یعنی لنکا یا سنگل دیپ) میں ہوا جو کہ ہندوستان کا ایک ٹکڑا ہے۔

جس دور انسانی کا آغاز لنکا سے ہوا وہ طوفان نوح کے وقوع پر ختم ہوگیا۔ بعد ازاں طبقہ ثانیہ کے آدم ثانی یعنی نوح علیہ السلام سے انسانی آبادی کا دوسرا دور شروع ہوا جو اب تک جاری ہے۔ اور قیامت تک جاری رہے گا۔ طوفان نوح کا واقعہ صرف قرآن ہی میں نہیں بلکہ توریت مروجہ میں

بھی مذکور ہے۔ چینیوں کی پرانی کتابوں میں بھی درج ہے۔ قدیم یونانی تحریروں میں بھی پایا جاتا ہے۔ زرتشتیوں کی ژند اوستا میں بھی موجود ہے۔ ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔ تقریباً ہر قوم کا قدیم لٹریچر اس طوفان کے وقوع کی شہادت دیتا ہے مختلف بیانات میں جزوی اختلافات تو ضرور پائے جاتے ہیں اور مقامی رنگ ان میں بہت گہرائی کے ساتھ چڑھے ہوئے ہیں مگر صورت اصلی ان سب کی ایک ہے۔ بارش کی زیادتی اور پانی کے سیلاب سے طوفان کا آنا ساری مخلوق کا ہلاک ہو جانا، اور ایک شخص سے نسل انسانی کا دوبارہ جاری ہونا اور دنیا کا از سر نو آباد ہونا جملہ بیانات میں مشترک ہے۔

ہندو لٹریچر میں منو کے متعلق جو واقعات بیان کیے گئے ہیں اُن سے منو پر نوح علیہ السلام کا گمان کیا جاتا ہے۔ رگ وید میں منو کو بنی نوع انسان کا باپ کہا گیا ہے۔ اتھر وا وید میں بھی اس واقعہ کی جانب اشارہ موجود ہے۔ مہابھارت کی تیسری کتاب میں متسیوپاکھیانہ (یعنی مچھلی کا واقعہ) کے نام سے یہ سارا واقعہ بیان کیا گیا ہے جو مختصر یہ ہے کہ ایک چھوٹی سی مچھلی نے منو کو آنے والے طوفان سے متنبہ کیا اور کہا کہ مجھے پال لو اور میں وقت پر کام آؤں گی اور تمہیں طوفان میں تباہی سے بچاؤں گی۔ منو نے اُس مچھلی کو پال لیا۔ رفتہ رفتہ وہ مچھلی بڑی ہوتی گئی یہاں تک کہ بہت بڑی ہو گئی مچھلی کے مشورہ سے منو نے ایک بڑی سی کشتی یا جہاز بنایا۔ جب طوفان آیا تو منو نے اپنے جہاز کو مچھلی سے باندھ دیا اور مچھلی اس جہاز کو کھینچ کر جانب شمال لے گئی۔ اور ایک پہاڑ پر ٹھیرا دیا طوفان کے بعد منو کی اولاد سے ساری دنیا پھر آباد ہوئی۔ شتپتھ برہمنان میں بھی یہ واقعہ درج ہے مگر یہاں مچھلی اپنے آپ کو برہما بتلاتی ہے۔ بھاگوت پران میں بھی یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ مگر اس بیان میں منو کو بنی نوع انسان کا باپ نہیں بلکہ خالق کائنات اور دنیا کو از سر نو پیدا کرنے والا قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ مہابھارت میں صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ منو نے اپنی بیٹی

اولاد پیدا کی اور اس اولاد سے تمام دنیا از سر نو آباد ہوی۔ متسیہ مچھلی کو کہتے ہیں اور متسیہ پران کے نام سے ہندوؤں کے اٹھارہ پرانوں میں سے ایک مستقل پران موجود ہے جس میں یہ واقعہ نہایت شرح و بسط سے درج ہے۔

قرآن مجید کی رو سے نوح علیہ السلام کی کشتی کوہ جودی پر ٹھیری تھی۔ صاحب مجمع البحار کہتے ہیں کہ دجلہ و فرات کے درمیان یہ پہاڑ واقع ہے۔ توریت میں اس پہاڑ کا نام جس پر یہ کشتی ٹھیری کوہ اراراٹ (Ararat) بیان ہوا ہے۔ اہل کتاب اس پہاڑ کو دجلہ کے مشرق کی جانب کردستانی سلسلہ کوہ میں تبلاتے ہیں۔ اور یورپ کے جدید جغرافیہ دان کہتے ہیں کہ یہ پہاڑ ملک آرمینیہ میں ہے۔ اس کی بلندی سطح سمندر سے ۱۶۹۱۶ فٹ اونچی بیان کی جاتی ہے۔ ہندو لٹریچر میں اس پہاڑ کا نام جس پر منو کے جہاز نے قرار پکڑا ناؤ بندھنا لکھا ہے مگر شتپتھہ برہمنا میں اس کا نام منوراؤ سرپنہ تبلایا گیا ہے۔ تو گویا دنیا کی آبادی کا دور حاضر اس مقام سے شروع ہوا ہے۔ جہاں اس طوفان کے بعد کشتی اور کشتی والوں نے قرار پکڑا اور زمین کے مختلف حصوں میں لوگ وہیں سے تقسیم ہوئے۔

یورپ والے ان باتوں کو نہ مانتے ہوں تو نہ مانیں مگر ایسی صورت میں جبکہ ان کے پاس ان قدیم ایام کے متعلق کوئی صحیح معلومات نہیں اور صحیح معلومات حاصل کرنے کا کوئی قابل اعتماد ذریعہ بھی نہیں ہمیں ضرورت ہی کیا ہے کہ ہم ان کے غلط اور بے بنیاد نظریوں اور طفلانہ ظنیات میں آ کر پھنسے پھریں اور اپنے یقینیات کو متزلزل کر دیں۔ مذہبی لوگوں کے لیے وہ معلومات جو کشف والہام کے تحت میں حاصل کیگئی ہو بہت زیادہ قابل اعتماد ہے بہ نسبت اُس قصیر العمر رجماً بالغیب کے جو یورپ کے جدت پسندوں کا آج کل حصہ ہے۔

مسلمان مورخوں نے اولاد نوح کے دنیا میں منتشر ہونے کی کیفیت پر خاصی روشنی ڈالی ہے

بوجہ ایک برگزیدہ پیغمبر ہونے کے نوح علیہ السلام کا مسلمانوں کے دلوں میں وہی احترام ہے جو کہ مذہبی ہدایت کے تحت میں ہونا چاہیے اور وہ اسے کبھی پسند نہ کریں گے کہ دیدہ و دانستہ وہ نوح علیہ السلام یا ان کی اولاد کو غلط واقعات کے ساتھ متہم کریں۔ نوح علیہ السلام کے مسکن یا مساکن سے ان کو ایک گونہ قرب مکانی بھی حاصل رہا ہے اور طوفان نوح و ما بعد کے متعلق روایات قدیمہ سے وہ لوگ زیادہ مانوس ہیں۔ پھر مسلمانوں کا ذوق تاریخ بھی مسلّم ہے۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان مورخین کی تحقیقات کو اس معاملہ میں بالکل نظر انداز کر دیا جائے۔ تاریخ فرشتہ میں اولاد نوح کی اس تقسیم کی بابت جو صراحت کی گئی ہے وہ مندرجہ ذیل نقشہ سے بیک نظر مجملاً سمجھ میں آجائے گی۔

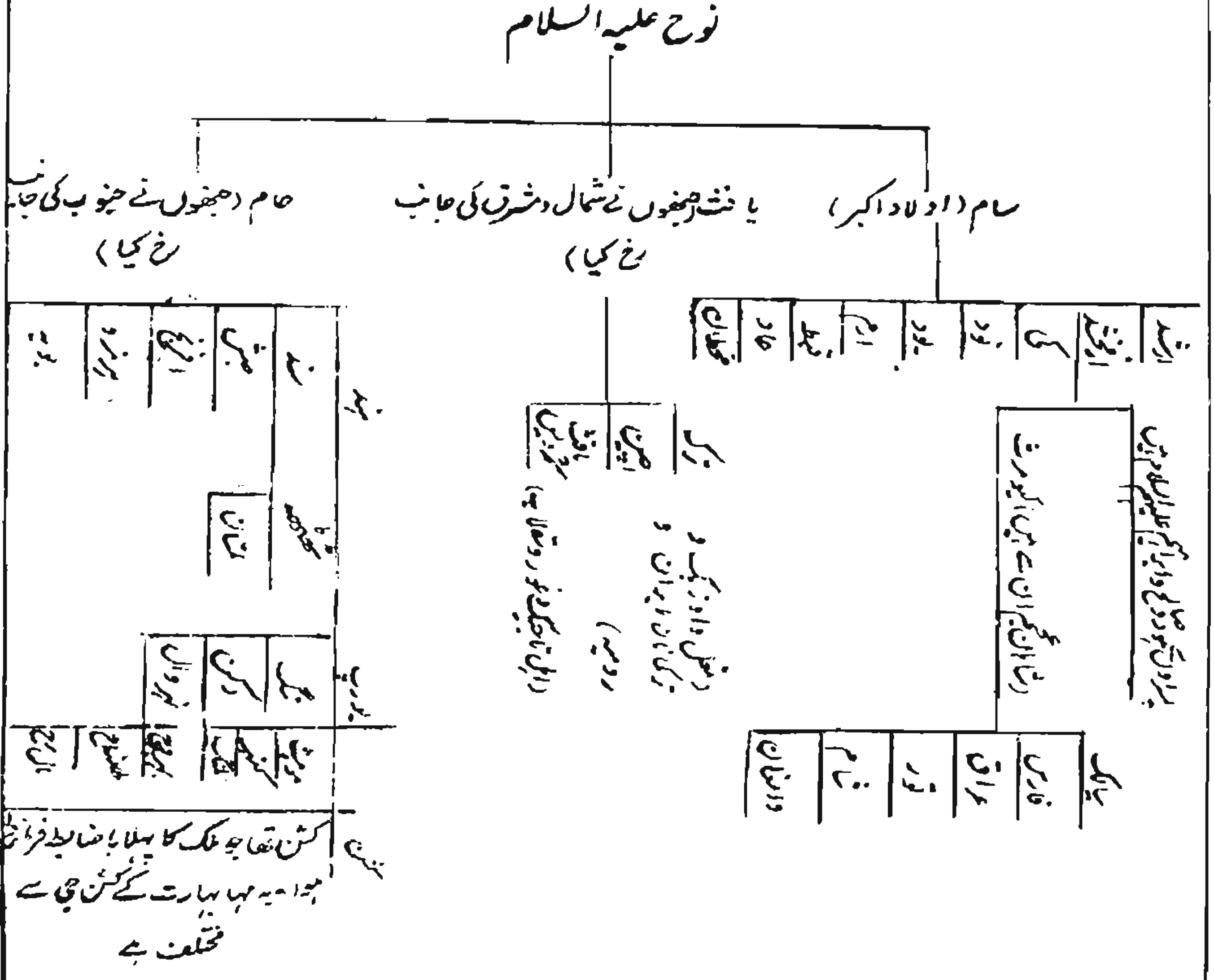

مندرجہ بالا نقشہ میں کا ہر شخص جس ملک میں جا کر بسا اس ملک اور اس شخص کی نسل کا وہی نام پڑ گیا

یہ طوفان نوح کے بعد کا پہلا نقشہ ہے جس سے آبادیوں کی تقسیم کا حال معلوم ہوتا ہے۔ اس سے ہند وسندھ وبنگال وغیرہ کی وجہ تسمیہ بھی معلوم ہوتی ہے۔ یہ پہلا نقشہ ہے جس کے بعد لوگوں کی مزید نقل و حرکت سے متعدد اور پیچ در پیچ تبدیلیاں بھی واقع ہوئیں اور نسلیں بھی مخلوط ہوئیں ہندوستان کے قدیم ترین باشندے وہی ہیں جن کی جانب اس نقشہ میں اشارہ ہے نہ کہ وہ جو آسٹریلیا اور جاوا وغیرہ سے آئے ہوئے بیان کیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد اس کبوتر خانہ میں بہت سی قومیں آئیں بعض واپس گئیں اور بعض رہ پڑیں۔ بعض کا کچھ حصہ گیا اور کچھ حصہ رہا۔ ان آنے والی اجنبی قوموں میں سے دراوڑین بھی ہیں اور آریہ بھی اور ان کے علاوہ اور بھی۔ فتوحات اسلام سے قبل جو یہاں آئے اور رہ گئے وہ رفتہ رفتہ "ہندو" بن گئے یا کہلائے جانے لگے۔ مگر ان کی بولیاں، ان کے عقائد، ان کے رسوم و رواجات، حتیٰ کہ ان کی "ذات" تک میں بہت نمایاں اختلافات رہے اور اب تک ہیں۔

یہ باہر سے آنے والی اجنبی قومیں خالی ہاتھ نہیں آئیں بلکہ غیر ممالک سے بہت سے خارجی اثرات اپنے ساتھ لے کر آئیں۔ یہ خیال غلط ہے کہ ہندو تمدن ہر لحاظ سے بلا شرکت غیرے ہندی یا ملکی ہے اور بیرونی تمدنوں کا کسی بات میں زیر بار احسان نہیں۔ ناممکن ہے کہ اجنبی اقوام کے ساتھ اجنبی اثرات اس ملک میں داخل نہ ہوئے ہوں۔ اب تک کی معلومات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ کم از کم مصری، بابلی، اسرائیلی، اور ایرانی اثرات بہت کافی حد تک اپنے ہمراہ لے کر آئے اور ان کے مذہب و تمدن و معاشرت میں وہ تمام اثرات راسخ ہو چکے تھے۔

یہ ساری بحث عہد ماقبل تاریخ سے متعلق تھی۔

اب ذرا دور تاریخی پر بھی نظر ڈال لیجئے کہ یہ اجنبی لوگ اس ملک میں آنے کے بعد کن داخلی و خارجی اثرات سے متاثر ہوئے۔

کیا خوب ہوتا اگر ہندو عہد کے واقعات ہندوؤں ہی کی لکھی ہوئی تواریخ پر ہم مبنی کرتے مگر تعجب آمیز افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس نوع کے مواد کا ہندوؤں میں کہیں وجود نہیں پایا جاتا تعجب اس بات پر ہے کہ ہندو (آرین ہوں خواہ ڈراویڈین) اگرچہ اس ملک میں اصلاً اجنبی ہیں مگر بہت عرصہ سے یہاں آئے ہوئے ہیں اور اب اسی برّ اعظم میں مقید و محدود ہوگئے ہیں۔ یہاں انھیں بڑے بڑے معرکے پیش آئے، بڑے بڑے مقابلے انہیں کرنے پڑے، بڑے بڑے سورما اور سیناپتی، مدبّر و سیاست دان، رشی اور منی، پنڈت اور گیانی، موجد اور کاریگر، اور عجیب و غریب قابلیت کے لوگ ان میں پیدا ہوئے، اپنی علمی قابلیت کے اظہار اور دماغی جولانیوں کے لیے انھیں اتنا وسیع میدان ملا، مگر افسوس ہے کہ تحقیق و تنقید و روایت و درایت کے اصولوں کو پیش نظر رکھکر اپنی سرگذشت قلمبند اور اپنے کارنامے محفوظ کرنے کا انہیں خیال تک نہ پیدا ہوا اور ایک بھی کتاب انھوں نے ایسی نہ لکھی جسے صحیح طور پر تاریخ کہا جاسکے۔ اُن کی ساری تاریخ دانی کا دار و مدار مہابھارت پر ہے جو خلاف عقل خلاف قیاس خلاف درایت اور بلا حوالہ اسمائے راویان چند حکایتوں، افسانوں اور کہانیوں کا مجموعہ ہے جس میں نہ واقعات کی ترتیب زمانی کا، نہ اُن کے سنہ و سال کا پتہ چلتا ہے، نہ اس پوری کتاب کے مصنف یا مصنفین کے متعلق ہندوؤں میں اتفاق ہے، نہ امتیاز ہوتا ہے کہ صحیح واقعہ کہاں ختم ہوتا ہے اور مذہبی حسن عقیدت و اکابر پرستی کہاں سے شروع ہوتی ہے اس کا سبب یہی ہوسکتا ہے کہ تاریخ نویسی کا صحیح ذوق اس زمانہ میں دنیا میں پیدا ہی نہ ہوا تھا اہل یورپ نے بیچارے ہندوؤں پر تان تان کر آوازے کسے ہیں کہ ہندوؤں میں تاریخ نویسی کا مادہ تھا نہ ذوق۔ ہندو لٹریچر میں تاریخی مواد کا مطلق وجود نہیں۔ ہندو عہد کے متعلق تاریخی واقعات کا پتہ چلانا دشوار ہے۔ غلط اور بعید از عقل افسانوں کا نام انھوں نے تاریخ رکھ لیا ہے۔ اگرچہ ہندوؤں کے متعلق اُن کے یہ اقوال درست ہیں مگر ہم اُن سے پوچھتے ہیں کہ دورِ حاضرہ کی عالمگیر

بیداری سے قبل خود اہل یورپ ہی نے کونسی قابل قدر اور قابل وقعت تاریخیں لکھی ہیں جنہیں مستند اور قابل اعتماد سمجھا جا سکتا ہو اور جن پر صحیح معنی میں تاریخ کا اطلاق ہو سکتا ہو۔ پہلے وہ اپنا کوئی کارنامہ پیش کریں اس کے بعد دوسروں کے منہ نہ آئیں۔

اس زمانہ میں یورپ خود جہل کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہاں نہ علم تھا نہ مذہب۔ نہ معقولیت نہ انصاف۔ پادریوں کی نفسانیت و دنیا طلبی و حرص و وجاہت پرستی کا نام مذہب رکھ لیا گیا تھا۔ اُن پادریوں کے مسلک کے خلاف کوئی کہتا تھا یا لکھتا تھا تو مرتد قرار پاتا تھا اور دردناک عذاب سے قتل کر دیا جاتا تھا۔ لاکھوں کی تعداد میں لوگ اُن پادریوں کے ظلم و نفسانیت کا شکار ہوتے رہتے تھے۔ جو کتابیں پادریوں کے خلاف لکھی جاتی تھیں وہ جلادی جاتی تھیں۔ نہ آزادی خیال کا وجود تھا نہ آزادی تقریر کا نہ آزادی تحریر کا۔ ترقی کی راہیں مسدود تھیں جس زمانے میں حق بات کا زبان سے نکالنا ناقابل معافی جرم ہو سچی تاریخ نویسی کا وجود کیونکر قیاس میں آسکتا ہے؟ اس زمانہ میں اس ملک میں بھی خوش عقیدگی یا خوشامد کی بنا پر اکابر قوم کے حالات مبالغہ آمیز نظم یا نثر میں تصنیف کئے جاتے تھے سنہ و تاریخ کا کوئی اندراج نہ ہوتا تھا۔ ان تصنیف شدہ حالات میں بعد میں بھی گم نام مصنفوں کی طرف سے مزید مبالغہ آمیز اضافے ہوتے رہتے تھے۔ اور صدیوں بعد ان ہی ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ سے تاریخی واقعات کا استخراج کیا جاتا تھا اور اُن پر تاریخی تصانیف و تالیفات کی بنیاد رکھی جاتی تھی کچھ عرصہ بعد اصلی مصنفین کے وجود میں بھی اختلاف ہو جایا کرتا تھا اور بحثیں چھڑ جاتی تھیں کہ مصنفِ اصلی کا لکھا ہوا حصہ کتنا ہے اور بعد میں اضافے یا تغیرات کیا گیا ہوئے۔

دوسری چیز جس پر اس دور کے تاریخ نویسوں کا دارومدار رہا ہے سیاحوں کے سفرنامے ہیں مگر اُن کا معتبر ہونا بھی یقینی نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں جسے امن و آزادی کا زمانہ

کہتے ہیں جب کہ دجہاز، دخانی گاڑیاں، ہوائی جہاز، موٹر اور دیگر جدید ساز و سامان کی بدولت سفر اس قدر آسان ہو گیا ہے، جب کہ اجنبی ممالک میں سیاحوں کے ٹھیرنے کے لیے ہوٹلوں کی آسائش اور حالات ملک دریافت کرنے کے لیے نقل و حرکت کی آسانیاں اور لوگوں سے میل جول پیدا کرنے کے لیے بکثرت کلب اور سوسائٹیاں موجود ہیں، یورپ اور امریکہ سے جو سیاح ہمارے ملک میں آتے ہیں وہ ہمارے ملک کے صحیح حالات سے بےخبر رہتے ہیں۔ اور غلط حالات شایع کرتے ہیں۔ (جس کی ایک جدید مثال مس میو کی کتاب مدر انڈیا موجود ہے) تو بھلا زمانۂ قدیم کے سیاح جنھیں زیادہ مشکلات کا سامنا رہتا تھا۔ ممالک اجنبی کے صحیح حالات سے باخبر ہونے کا کیونکر اہتمام کر سکتے ہوں گے (و آزادی اشاعت کے مفقود ہونے کے زمانہ میں صحیح حالات کی اشاعت کی وہ کیسے تاب لا سکتے ہوں گے ؟

یورپ کی موجودہ بیداری جسے (Renaissance) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اس وقت وجود میں آئی جبکہ آفتاب رسالت عرب میں طلوع ہو چکا تھا، مسلمان اسپین میں آٹھ سو برس تک علم و ترقی کے ڈنکے بجا چکے تھے، مشرق و مغرب کا اتصال جنگہائے صلیبی کے پھیروں کے پیچھے عمل میں آ چکا تھا اور ترک (۱۴۵۳ء میں) قسطنطنیہ فتح کر چکے تھے۔ اسپین کی یونیورسٹیاں علم و معقولیت کی شعاعیں یورپ میں پھیلا چکی تھیں۔ قدیم علوم و معقولات کو عربوں نے اپنی بیش بہا تالیفات و تراجم و تفاسیر و حواشی سے عام فہم بنا کر نہ صرف یورپ بلکہ تمام دنیا کے لیے ممکن الحصول بنا دیا تھا اور اس طرح ان مردہ علوم کو از سر نو زندگی بخشدی تھی۔ اجنبی اور غیر اقوام پر عدل و شفقت سے حکومت کرنے کی وہ عدیم المثال روشن دنیا دیکھ چکی تھی جس کی نظیر تاریخ نے نہ اس سے قبل پیش کی نہ اس کے بعد۔

اس (Renaissance) کا آغاز یورپ میں پندرھویں صدی کے وسط سے تسلیم کیا جاتا ہے جب کہ محمدیوں کو میدان میں آئے ہوئے آٹھ سو برس ہو چکے تھے۔ اسلامی اثر کا

تدریجی اثر محسوس ہونا تو بہت پہلے سے شروع ہو چکا تھا۔ پندرھویں صدی کا وسط در اصل وہ زمانہ ہے جبکہ یہ اثر پوری طرح بھڑک اُٹھا۔

سب سے پہلے اس بیداری کا اثر اٹلی میں ہوا۔ اٹلی سے یہ اثر فرانس اور جرمنی پہونچا۔ ایک عرصہ کے بعد انگلستان کو بھی یہ اثر قبول کرنا پڑا اور سولھویں صدی کے آخر میں جاکر وہاں یونیورسٹیاں وغیرہ قائم ہوئیں۔ اٹلی میں جن لوگوں کی تحریروں نے اس بیداری کو پیدا کیا اُن میں سب سے زیادہ نمایاں شخص ڈینٹے (Dante) تھا جو مسلمانوں کے لٹریچر سے بڑی حد تک متاثر ہو چکا تھا۔ (Divina Commedia) اُس کی ایک مشہور نظم ہے جو پورے یورپ میں مقبول ہو چکی ہے اور یورپ کی تقریباً ہر زبان میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس نظم میں برزخ و جنت و دوزخ کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ مبصرین یورپ اب اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ڈینٹے نے اس مشہور نظم میں شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربی رح کی مشہور کتاب فتوحات مکیہ کا حرفاً حرفاً اتباع کیا اور اتباع اس قدر تفصیلی اور جزئیات تک میں ہے کہ یورپ کے محققین بھی اسے توارد قرار دینے سے انکار کرتے ہیں۔

اہل یورپ کی مصلحتیں انھیں کسی حق بات کو علانیہ تسلیم نہ کرنے دیں تو یہ ایک جداگانہ امر ہے مگر واقعات ہمیشہ واقعات ہی رہیں گے اور یہ ایک واقعہ ہے کہ مثل دیگر علوم وفنون کے فن تاریخ نویسی میں بھی یوروپین مورخین نے اسلامی مورخین سے سبق پڑھا۔ طرز جدید کی اس محققانہ تاریخ نویسی کے فن کے موجد صرف مسلمان ہی ہیں۔ مسلمانوں کو جو قوی تعلق اپنے مذہب سے رہا ہے اُس کی بناء پر انھوں نے روایات مذہبی کی چھان بین اور تحقیق و تنقید و تحفظ کے لیے ایسے عجیب و غریب اصول و قواعد مرتب کیے کہ اس معاملہ میں وہ دنیا میں فرد ہیں اور اس فن تنقید روایات کی مثال دنیا کی کسی دوسری قوم میں نظر نہیں آتی۔ یہ کہنے میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ مسلمانوں کی اس ایجاد سے قبل محققانہ شان کی تاریخ نویسی کا اس دنیا میں وجود ہی نہ تھا۔ نہ کسی نے اس طرف توجہ کی نہ

غالباً اس ضرورت کو محسوس کیا۔ اِن حالات میں اگر ہندوؤں نے بھی اِس طرف توجہ نہ کی تو اُن پر کوئی ایسا الزام عاید نہیں ہوتا جس میں اُن کی دیگر ہمعصر اقوام بھی اُن کے ساتھ شریک نہ ہوں۔

افسوس اس امر کا ہے کہ اہل یورپ نے مسلمانوں سے یہ فن حاصل کرکے بھی کوئی مفید کام اس سے نہ لیا۔ اسے اظہار حق کے لیے وقف نہ کیا بلکہ اپنی محدود ذاتی قومی اور ملکی اغراض کو پیش نظر رکھ کر پروپیگنڈا میں وہ اُسے صرف کرنے لگے جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ اہل یورپ کی لکھی ہوی تاریخیں (خصوصاً مشرقی اقوام وممالک کے متعلق) آج اُسی بے اعتمادی کی مستحق ہیں جو حالات عہد ماقبل تاریخ کی تحریرات کے حصہ میں آچکی ہے۔ آج بھی تحریروں پر احتساب ہے منظور شدہ مضامین ہی کے شائع ہونے کی اجازت ملتی ہے۔ فرمانروا گروہ کی اغراض کے خلاف تحریر وتقریر پر یورپ کے ہر ملک میں گرفت ہوتی ہے اور قہر برسایا جاتا ہے ہمیں انھیں امور کا علم ہونے پاتا ہے یا ان امور کا اُسیقدر علم دیا جاتا ہے جتنا کہ صاحب اقتدار جماعت کی پالیسی سے ٹکراتا نہ ہو۔ جو قومیں کہ ہم کو اس کی بھی پوری اطلاع نہیں ہونے دیتیں کہ آج ہمارے اردگرد دنیا میں کیا ہو رہا ہے ان اقوام کی تحریری کارستانیوں کی وساطت سے ہم صدیوں قبل کے صحیح واقعات کا علم اطمینان بخش طور پر کیوں کر حاصل کر سکتے ہیں۔

تاریخ کے اس پہلو پر روشنی ڈالنے کی ضرورت یہاں اس لیے پیش آئی کہ ہم اس مضحکہ انگیز نظارہ کو اکثر دیکھتے ہیں کہ آج کل جدید علمی حلقوں کے بعض سادہ لوح یوروپین تحریروں کے ہر رطب ویابس کو آنکھ بند کرکے قبول کرلیتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں غیر اقوام کی تحریروں کو ٹھکرا دیتے ہیں مسلمانوں کی لکھی ہوی تاریخوں کے اُن واقعات کو جنسے یورپ کو اختلاف ہے بے تکلف غیر معتبر قرار دے دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو ہم آگاہ کر دینا چاہتے ہیں کہ ہماری روش اس کے بالکل برخلاف ہے ہمارے نزدیک جس شخص کا باطن زہد وتقوے وللّٰہیت کی زینت سے جس قدر آراستہ ہوگا اُسکے اقوال اُسی درجہ تصدیق وقبولیت کے مستحق ہوں گے۔ جب تک کہ دنیا کا بڑا حصہ حق تعالیٰ کو اُن

اسماء وصفات کے ساتھ جو اُس کی شان کے شایان ہیں دل سے قبول نہ کریگا صدق واخلاص وحق بینی وحق پسندی وعدل وامن واطمینان کا تسلط اس جہان میں نہ ہوسکیگا نفس پرستی اور ملک پرستی یہ سب تقلید پرستی ہی کے مختلف نام ہیں جو اطلاق پرستی کی ضد ہے جن تحریروں اور تقریروں اور تاریخوں اور سفرناموں اور رپورٹوں میں ملک پرستی، قوم پرستی، اور اغراض ذاتی وقومی وملکی کی رنگ آمیزی داخل ہوگئی ہو وہ بغیر کافی تنقید وتحقیق کے ہرگز قابل قبول نہیں ہوسکتیں جن لوگوں کا مذہب سیاست ہو، جن کا مقصد زندگی صرف علو فی الارض ہو ان کا کوئی کام سیاسی رنگ آمیزی سے خالی نہیں ہوسکتا اور یہ رنگ آمیزیاں حق کی باطل شکن روشنی کی تاب کسی حالت میں بھی نہیں لاسکتیں۔

اِن ضمنی مگر نہایت ضروری امور پر نظر ڈالنے کے بعد ہم اب اپنے اصلی سلسلہ بیان کی جانب رجوع ہوتے ہیں۔

ہندوؤں کے اس ملک میں آنے کے بعد اُن پر مسلسل حملے ہوتے رہے اور وہ اپنے فاتحوں کے اثرات قبول کرتے رہے۔

ایرانیوں کے بکثرت حملے ہوئے اور ایک مدت دراز تک ہندوستان ایرانیوں کے قبضہ میں اور ایرانیوں کے زیر اثر اور ایران کا خراج گذار رہا۔ مہاراج فرمانروائے ہند شمالی کے عہد میں ایرانیوں نے دو مرتبہ ہند پر چڑھائی کی۔ اُس زمانہ میں فریدون ایران کا بادشاہ تھا جس کے حکم سے پہلے گرشیب بن اطرد سپہ سالار بن کر آیا اور دوسری مرتبہ سام نریمان لشکر لے کر آیا اور غلبہ حاصل کر کے پنجاب و سندھ و کابل کو ایران کی جاگیر بنا کر گیا۔ راجہ کیشوراج کے زمانے میں زمینداران دکن وسنگل دیپ نے متحد ہو کر اس شدومد سے کیشوراج کے مقابلہ میں بغاوت کی کہ اُسے ایران سے استمداد کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ منوچہر شاہ ایران نے سام نریمان کو فوج کے ساتھ روانہ کیا جس کی مدد سے وہ بغاوت فرو ہوئی۔ واپسی پر کیشوراج سرحد پنجاب تک سام نریمان کے ہمرکاب گیا اور گراں قدر تحفے تحائف

دیکر اسے رخصت کیا۔ راجہ فیروز رائے نے اپنے عہد میں ایرانیوں سے بغاوت کی اور پنجاب پر قبضہ کر لیا جب رستم کا دور آیا تو رستم نے ہند پر فوج کشی کی۔ فیروز رائے تاب مقاومت نہ لاسکا تو کوہستان ترہٹ کی جانب بھاگا۔ اُس کا تعاقب کیا گیا۔ چنانچہ اسی دوڑ دھوپ میں وہ ہلاک ہو گیا۔ رستم نے اُس کی اولاد میں سے کسی کو تخت پر نہ آنے دیا بلکہ سرداران ہند میں سے ایک شخص مُسمّی سورج کو ہندوستان کے تخت پر بٹھا دیا۔ سورج نے اپنی بھانجی کی شادی رستم سے کر دی اور کیقباد شاہ ایران کی مدت العمر اطاعت و فرمانبرداری کرتا رہا اور سالانہ خراج پابندی کے ساتھ بھیجتا رہا۔ سورج کے زمانہ میں ایرانیوں اور ہندیوں میں میل جول بہت بڑھ گیا تھا اور بہت سی ایرانی رسمیں اِس ملک میں داخل ہو گئی تھیں۔ قنوج اسی زمانہ میں آباد ہوا۔ آفتاب پرستی، آتش پرستی، اور بت پرستی کو اِس عہد میں بہت فروغ ہوا۔ قنوج کے بت خانے اسی عہد کی یادگار ہیں۔ راجہ شنگل نے تخت پر آکر پھر ایران سے بغاوت کی۔ اُس زمانہ کا شاہ ایران افراسیاب تھا جو سخت برہم ہوا۔ اپنے سپہ سالار کو پچاس ہزار سپاہ کے ہمراہ اُس نے انتقام کے لیے روانہ کیا۔ ہند میں آکر یہ ایرانی لشکر تیسرے ہی دن شکست کھا کر بھاگا اور قریب کے پہاڑوں میں ایک مستحکم مقام پر پناہ گزین ہوا۔ افراسیاب نے سنا تو غضبناک ہو گیا اور ایک لاکھ لشکر جرار لے کر نہایت سرعت کے ساتھ اچانک خود آدھمکا۔ اپنی غضبناکی کے جوش میں اس نے قتل و غارت گری کا وہ مہیب و عبرتناک نقشہ کھینچا کہ اس کی مثالیں تاریخ میں بہت کم پائی جاتی ہیں۔ شنگل بنگالہ کی طرف بھاگ نکلا۔ اس کا تعاقب کیا گیا اور اس تعاقب میں بنگالہ کا ملک غارت ہو گیا۔ جب شنگل کو پناہ کی کوئی جگہ نہ ملی تو گھبرا کر اُس نے افراسیاب کو پیغام بھیجا کہ خطا معاف ہو تو حاضر خدمت ہو کر دولت پابوسی کا شرف حاصل کروں۔ افراسیاب نے درخواست قبول کی۔ تیغ و کفن باندھ کر حاضر ہوا، قدموں پر گرا، اور خواہشمند ہوا کہ اب مجھے اپنی غلامی میں قبول فرما کر ایران ساتھ چلنے کی اجازت دی جائے۔ افراسیاب کو یہ ادا پسند آئی اور اس نے اس درخواست کو

بھی قبول کر لیا اور شنگل کے بیٹے برہمت کو ہندوستان کے تخت پر بٹھا دیا۔ برہمت جب تک زندہ رہا شاہ ایران کا مطیع و فرمانبردار رہا۔ اپنی آمدنی کے تین حصے کرتا تھا۔ ایک حصہ خیرات کرتا تھا۔ دوسرا حصہ اپنے باپ اور افراسیاب کی خدمت میں بھیجتا تھا۔ اور تیسرا حصہ اپنی سلطنت پر خرچ کرتا تھا۔ نمونہ کے طور پر عہد قدیم کے یہ چند واقعات ہیں جن سے یورپین تاریخیں بیشتر معرا ہیں اور جو اس قوم کے مورخین کے قلمبند کیے ہوئے ہیں جو صحیح فن تاریخ نویسی کی موجد ہے۔ روضۃ الصفا میں تو اریخ ایران سے منقول ہے کہ :-

"چون اسفندیار از مہم ارجاسپ فارغ شد در ولایت چین و تتار رفت و در آن سرزمین آتشکدہ ہا ترتیب دادہ خلائق را بر التزام ملت مجوس تکلیف کرد و از آن حدود براہ دریا متوجہ ہندوستان گشت و در آن بلاد نیز کیش آتش پرستی را رواج تمام داد"

خود اسفندیار کا مقولہ اس کتاب میں مندرجہ ذیل الفاظ میں مرقوم ہے:-

"از راہ دریا رخت بہندوستان کشیدم و ہندیان در مقام معارضہ آمدند مہم بتقالمہ انجامید چندان محاربہ کردم کہ براوشان غالب گشتم و سرداران دیار ہند را اسیر کردہ در گردن خرطوم پیلان آویختم و یکہزار و سیصد فرسنگ از بلاد آن دیار در زیر قدم آوردم و در اقصیٰ بلاد ہندوستان معابد بسیار بنا نمودم"

اس نوع کے واقعات مسلسل کا حساب لگانے سے تخمینہ ہوتا ہے کہ دو سوا دو ہزار برس قبل مسیح سے ہندوستان اہل ایران کا تختہ مشق بنا رہا اور ایرانی تمدن اور مذہب کا اثر اس ملک میں بزور شمشیر پھیلایا گیا۔

جب ایران کو یونانیوں نے تہ و بالا کر دیا تو اہل یونان کی بھی توجہ ہندوستان کی جانب

منعطف ہوی۔ چنانچہ سکندر اعظم (Alexander The Great) کا ہندوستان پر مشہور حملہ وہ تاریخی اہمیت رکھتا ہے جس سے اہل یورپ بھی بے خبر نہ رہ سکے۔ یوروپین مورخین کو اعتراف ہے کہ ہمیں ہندوستان کے کسی قدر تفصیلی حالات سکندر ہی کے حملہ کی بدولت یونانی تحریروں سے معلوم ہوے ہیں۔ اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ ہندوستان کی تاریخ پر پھر ہمارے لیے تاریکی چھا جاتی ہے یہاں تک کہ مسلمان ہندوستان پر حملہ آور ہوتے ہیں اور اپنے لٹریچر کو تاریخی معلومات سے لبریز کر دیتے ہیں۔

سنہ ۳۲۶ قبل مسیح سکندر نے دریائے سندھ عبور کر کے دریائے جہلم کا رخ کیا۔ ایک خونخوار جنگ کے بعد راجہ پورس (Porus) پر غلبہ پایا۔ دریائے گنگا کی جانب بڑھنے کا قصد تھا کہ فوج کی بد دلی سے واپسی پر مجبور ہوا چنانچہ پنجاب میں دو سال کے قیام اور معاربوں کے بعد دریائے سندھ کی راہ سے واپس ہوا۔ اسی عرصہ میں اس نے یہاں لوگوں سے میل جول پیدا کیا۔ والیان ملک اور سرداران ذی وقار سے دوستانہ تعلقات قائم کیے کچھ شہر آباد کیے چند قلعے تعمیر کیے ہندیوں اور یونانیوں میں آپس میں بکثرت بیاہ شادیاں ہونے دیں اور بہت بڑی تعداد میں یونانیوں کو یہاں چھوڑ گیا جو اس ملک میں رہ پڑے اور یہیں کے ہو گئے۔

چندر گپتا (موریا) ہندوستان کا رہنے والا ایک تیز اور چلتا ہوا شخص تھا۔ وادی گنگا سے جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ سکندر کی آمد کا شور سن کر اس کے پاس پہنچ گیا اور جس تدبیر سے اس کی نگاہ میں وقیع بن کر اس کے کیمپ میں داخل ہو گیا۔ سکندر کی واپسی کے بعد اس ملک میں گڑبڑ مچی اس سے فائدہ اٹھا کر چندر گپتا سنہ ۳۲۲ قبل مسیح میں ملک بہار کا بادشاہ بن گیا اور رفتہ رفتہ ہندوستان کے بڑے حصہ کا فرمانروا ہو گیا۔ ادھر سکندر نے سنہ ۳۲۳ قبل مسیح وفات پائی تو اس کی ساری مملکت اس کے سپہ سالاروں میں تقسیم ہو گئی۔ اور اس کے ایشیائی مقبوضات اس کے سپہ سالار سلیوکس (Seleucus) کے قبضہ میں آ گئے۔ چندر گپتا نے اس جدید یونانی فرمانروائے مشرق کی دختر سے شادی کر کے تعلقات یگانگت کو بڑھا

پھر چندر گپتا اور اس کے خاندان نے عرصہ تک ہندوستان پر حکومت کی۔ بودھ مذہب کو قبول کرنے والا اور فروغ دینے والا ہندوستان کا مشہور اور زبردست بادشاہ اشوک جس کے مقبوضات افغانستان، بلوچستان، کشمیر سے لے کر نیپال، بنگال اور دکن تک پھیل گئے تھے اسی چندر گپتا کا پوتا تھا

یونانی اثرات کا غلبہ ہندوستان پر ۲۷۳ قبل مسیح سے لے کر ۲ قبل مسیح تک رہا۔ اس دور میں مشرق و مغرب کے درمیان راہیں کشادہ ہوگئیں۔ تجارتی تعلقات زیادہ قوی ہوگئے۔ مذہبی روایات و تمدنی و معاشرتی معاملات اور قومی وملکی رسم و رواج میں تبادلے واقع ہوئے۔ یہ بھی ایک بڑا سبب ہے، جو ہندو دیو مالا (Hindu Mythology) اور یونانی دیو مالا (Greek Mythology) میں اس درجہ قریبی مشابہت ہے۔ اس قریبی مشابہت پر سے پردہ آگے چل کر اٹھایا جائیگا۔ رگ وید سے جو ویدک اقوام کا تمدن ظاہر ہوتا ہے وہ قدیم یونانی تمدن سے بڑی حد تک ملتا جلتا ہے۔

بعد میں چند اور اجنبی اقوام بھی ہند میں داخل ہوئیں اور کسی قدر کشمکش کے بعد ہندو دول میں جذب ہوگئیں، مثلاً شاکا (Scythians) جو یونانی عہد ہی میں ۲۰ قبل مسیح سے آنا شروع ہوئے تین سو برس تک ان کا دور دورہ رہا ۳۰۰ء میں ان کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ یہ لوگ ہندوؤں میں جذب ہوگئے اور پنجاب کے جاٹ انہیں کی نسل سے بیان کیے جاتے ہیں۔ ان کا زور ٹوٹنے سے قبل ہی سے نواح چین سے وسط ایشیا ہوتی ہوی ایک قوم کشن (Kushans) آدھمکی اور اس نے بھی پورے شمالی ہند پر قبضہ کرلیا۔ خانہ جنگیوں اور بدنظمیوں کا یہ دور گپتا خاندان نے ختم کیا۔ اس خاندان کا بانی چندر گپتا تھا جو اپنے ہمنام سے جس کا ذکر سکندر کے سلسلہ میں پہلے آچکا ہے مختلف ہے اس گپتا خاندان کی حکومت ۳۲۰ء سے لیکر ۴۸۰ء تک رہی۔ یہ ہندوؤں کا عہد زرین قرار دیا جاتا ہے۔ اس عہد میں پانچ زبردست بادشاہ با اقتدار، صاحب وجاہت، علوم و فنون کو فروغ دینے والے

اور ملک میں خوش حالی پیدا کرنے والے گذرے۔ مگر اس عہد زرین کا خاتمہ اُس وحشی قوم نے کر دیا جو ہنس (Huns) کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں اس قوم نے ایران و افغانستان و ہندوستان کو تہ و بالا کر دیا۔ قتل و غارتگری و ظلم و سفاکی کا بازار گرم رکھا۔ ۵۶۵ء میں ترکوں نے وسط ایشیا میں ان لوگوں کا خاتمہ کر دیا اور ہندوستان کو ان کے عذاب سے بچا لیا مگر ہندوستان کی آبادی میں ایک جدید عنصر کا اضافہ بھی کر دیا۔ راجپوتوں کے چند قبائل انہیں کی نسل سے بیان کیے جاتے ہیں۔ ہنس کی سفاکیاں ہندوستان میں ۶۰۶ء تک قائم رہیں۔ اس کے بعد قنوج کے راجہ ہرشہ وردہان نے سارے شمالی ہند پر تسلط حاصل کر لیا مگر وہ لاولد مرا اور اس کے بعد ہند میں پھر طوائف الملوکی کا زور ہو گیا یہاں تک کہ محمد بن قاسم نے سندھ پر ۷۱۱ء میں حملہ کر دیا۔

سواحل ملابار پر عرب تاجروں کی آمد و رفت محمد بن قاسم کے سندھ آنے سے بھی قبل شروع ہو گئی تھی اور مسلمانوں کا مذہبی اثر ہند میں ساتویں صدی کے آخر سے محسوس ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس کا ثبوت وید کی اُن تفاسیر اور ہندوؤں کی اُن مذہبی تصانیف میں پایا جاتا ہے جو ساتویں صدی کے بعد وجود میں آئیں۔

اس کے بعد کے زمانے میں یوروپین اثرات کا جو غلبہ ہندوؤں کے مذہب و خیالات پر پایا جاتا ہے۔ اس کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

یہ سب خارجی اثرات کی فہرست ہے۔

منظر الکرام
حیدرآباد دکن کے زندہ اکابر و مشاہیر کا تذکرہ جدید حیدرآبادی اعلیٰ شخصیتوں کے متعلق اس سے بہتر ذخیرہ معلومات
مولفہ سید منظر علی اشہر — اب تک مرتب نہیں ہوا۔ سرکار عالی کے سررشتہ تعلیم نے اس کو حوالہ کی عمدہ کتاب قرار دے کر مدارس تحت کو
اس کے خریدنے کی ہدایت کی ہے۔ قیمت چھ روپے۔ مولف سے نظام والینڈز کلب خیرت آباد کے پتہ پر طلب کیجئے